مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر
'تدبر قرآن' (جلد دوم) کا مطالعہ

جناب سید خورشید حسن رضوی

راقم سطور کا ایک مضمون 'مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تفسیر 'تدبر قرآن' (جلد اول) کا مطالعہ' کے عنوان سے سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ جلد دوم کا مطالعہ جاری تھا کہ یہ احساس غالب آ گیا کہ یہ کام مجھ جیسے کم علموں کے کرنے کا نہیں ہے۔ پہلی جلد کے مطالعہ کو اہل علم کے سامنے پیش کر دینے سے وہ غایت پوری ہو گئی تھی کہ جو خامیاں مولانا اصلاحی کے طریقۂ تفسیر میں مجھے محسوس ہوئیں ان کی نشان دہی کر دی جائے، تاکہ ان کی روشنی میں اہل علم ان کی تفسیر کا تفصیلی جائزہ لیں۔ ایک بات جو خاص طور سے نوٹ کرنے کی ہے وہ ان کی غیر ذمہ دارانہ خیال آرائی ہے، جو غالباً نظمِ قرآن اور ربطِ آیات کی بہ تکلف تلاش کا نتیجہ ہے۔ میں نے آگے مطالعہ روک دیا، لیکن جس حد تک بھی نامکمل مطالعہ کر رکھا تھا وہ تحقیقات اسلامی کے مدیر محترم کی خواہش پر ہدیۂ ناظرین ہے۔

نوٹ:۔ صفحات کا حوالہ 'تدبر قرآن' شائع کردہ فاران فاونڈیشن پاکستان، ترتیب نو، طبع دوم، جون ۱۹۸۵ء سے دیا گیا ہے۔

تدبر قرآن کی جلد دوم سورہ آل عمران سے سورۂ مائدہ تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں صرف سورۂ آل عمران کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۰ و ۱۱

ذیلی عنوان 'سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے امتیازی پہلو' کے تحت مولانا اصلاحی

نے لکھا ہے:

'' سورۂ آلِ عمران پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب افق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورت حال نے اہلِ کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا، لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا، اس کے دلوں میں نہیں گھسا۔ دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا، لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی ..... اسی اثنا میں احد کا معرکہ پیش آیا، جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے ان کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہل کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی، جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آ گھسا تھا، جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دست برداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔''

یہ کہنا کہ یہودیوں کا ایک گروہ یعنی ان کی ایک قابل ذکر تعداد غزوۂ بدر کے بعد منافقانہ مسلمان ہوگئی تھی، جو غزوۂ احد کے بعد مرتد ہوگئی، تاریخ و سیرت کی روایات سے ظاہر نہیں ہے۔ ہاں یثرب کے مشرکین کا ایک گروہ منافقانہ مسلمان ہوا تھا۔ اس میں اور یہودیوں میں گٹھ جوڑ تھی۔ لیکن اس گروہ نے بھی علانیہ ارتداد کا اظہار نہیں کیا۔ مولانا اصلاحی کا مستقل یہ خیال ہے کہ مدینہ کے منافقین کی زیادہ تر تعداد یہودیوں پر مشتمل تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۳۶

ذیلی عنوان 'غزوۂ بدر میں کفار کے لئے نشانی' کے تحت لکھتے ہیں: ''بدر کے واقعہ میں کفار کے ان تمام گروہوں کے لیے غلبۂ حق کی نشانی موجود تھی جو اس وقت قرآن اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہود و نصاریٰ اور قریش تین جماعتیں براہِ راست

اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں''

مدنی عہد کی ابتدا میں مخالفین اسلام میں نصاریٰ کو بھی شامل کرنا درست نہیں ہے۔ غزوۂ بدر تک نصاریٰ کی کوئی مخالفانہ سرگرمی سامنے نہیں آئی تھی اور ان سے براہِ راست کوئی واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ مدینے میں ان کی کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس کے برخلاف حبشہ کے عیسائیوں کا جو تجربہ اب تک ہوا تھا وہ کافی خوش گوار تھا۔

اگلی سطروں میں ذیلی عنوان 'یہود کے لئے نشانی' کے تحت مولانا نے طالوت اور جالوت کی جنگ اور جنگِ بدر میں مشابہت بتاتے ہوئے لکھا ہے: ''جس طرح مسلمان اپنے گھروں سے نکالے اور اپنے قبلہ سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے گھروں اور اپنے قبلہ۔ تابوت۔ سے محروم کیے گئے تھے''۔

تدبر قرآن (جلد اول) کے مطالعہ میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ طالوت اور جالوت کی جنگ سے پہلے تابوت بنی اسرائیل کے پاس پہنچ چکا تھا، اس لئے اس جنگ میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا۔

صفحہ ۴۰

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (آیت:۱۴) کے تحت لکھتے ہیں: ''شھوات کا لفظ یہاں مشتہیات یعنی مرغوبات کے معنیٰ میں ہے... یہاں مجرد ان کی (مشتہیات کی) رغبت زیرِ بحث نہیں ہے، بلکہ ان کی تزئین کا ذکر ہے۔ ..... کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ، ظاہر ہے، فاطرِ فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ ..... اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔''

یہاں مولانا نے تزئین کو نفس اور شیطان کی کارستانی قرار دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ زُيِّنَ کے صیغۂ مجہول سے ظاہر ہوتا ہے، اس میں انسان کی مرضی اور ارادہ کو دخل نہیں ہے، لہٰذا بجائے خود یہ چیز فطری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا قرار دیا ہے۔ البتہ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ کی ترغیب دی ہے۔

یہاں ضمناً ایک اور حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ جن چیزوں کی تزئین کا یہاں ذکر

ہے یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو فی نفسہٖ مرغوب ہیں، کسی اور غرض یا فائدہ کے حصول کے لیے یہ مطلوب نہیں ہیں۔ اس بات کو ان کی 'قدرِ ذاتی' (Intrinsic Value) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے آج کل کے ماہرین مالیات سونے اور چاندی میں کسی قدرِ ذاتی کے منکر ہیں، اس لئے بہ حیثیت زر (ثمن) ان کے استعمال کی ضرورت کے قائل نہیں اور کاغذی سکے کو ہر لحاظ سے ان کا بدل تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس مفروضے کی تردید اس آیت سے ہو جاتی ہے۔ اس آیت کی رو سے سونا اور چاندی قدرِ ذاتی کے حامل ہیں، جو سارے انسانوں کے نزدیک یکساں ہے۔ ان ہی کے ذریعہ عالم گیر زرِ مبادلہ تشکیل پا سکتا ہے۔

صفحہ ۶۶

"لَایَتَّخِذِالْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ج وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِی شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً ط" (آیت ۲۸)

اس آیت کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے:

"اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے۔"

اس میں مولانا نے دون کا ترجمہ 'برخلاف' کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اس غلط ترجمہ کی وجہ سے اس آیت کے مفہوم میں جو بگاڑ پیدا ہوا ہے وہ ذیل کی تفصیل سے واضح ہوگا۔

اس آیت میں پہلے تو یہ کہا گیا کہ مومنین کفار کے ساتھ موالات نہ کریں دُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ پھر یہ کہا گیا کہ جو کوئی بھی ایسا کرے گا (یعنی موالات دون المؤمنین) تو اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مگر اس تحذیر سے بچنے کی ایک صورت ہے، وہ یہ کہ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً۔ مولانا اصلاحی کے ترجمہ کی رو سے اس میں تحذیر صرف اس صورت سے متعلق ہے جب کہ مومنوں کے برخلاف موالات کی جائے اور ایسی موالات کی صورت میں تحذیر سے نکلنے کی جو صورت ہے وہ یہ کہ مخالفِ اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے، یعنی اس طرح کی موالات ہی نہ کی جائے۔ اب کیا اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً کا فقرہ بے معنی

نہیں ہوگیا؟ یہ مقصد تو پہلے ٹکڑے لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکَافِرِیْنَ..... سے پورا ہوگیا تھا۔

دراصل اس آیت کا صحیح مفہوم وہی ہے جو دیگر سارے معتبر مفسرین نے بیان کیا ہے۔ چند مفسرین کے حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

ابن کثیرؒ: **ای الا من خاف فی بعض البلدان و الاوقات من شرھم ' فلہٗ ان یتقیھم بظاھرہٖ لا بباطنہٖ ونیتہ' کما حکاہ البخاری عن ابی الدرداء انہٗ قال: انا لنکشر فی وجوہ اقوام و قلوبنا لتلعنھم. وقال الثوری' قال ابن عباس: لیس التقیۃ بالعمل انما التقیۃ باللسان. یؤید ماقالوہ قول اللہ تعالیٰ: (مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ)**

شاہ ولی اللہ: باید کہ دوست نگیرند مسلمان کافراں را بجز اہلِ ایمان و ہرکہ ایں کند نیست در چیزے ازاں خدا مگر آں کہ دفع شر ایشاں کنید بنوعے از حذر کردن۔

شاہ عبدالقادر: نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو دوست سوائے مسلمانوں کے اور جو کوئی کرے یہ پس نہیں اللہ سے بیچ کسی چیز کے مگر یہ کہ بچو تم ان سے بچنے کر۔

شاہ رفیع الدین: نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو رفیق مسلمان چھوڑ کر اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اللہ کا کوئی نہیں مگر یہ کہ تم پکڑا چاہو ان سے بچاؤ۔

مولانا اشرف علی تھانوی: مسلمانوں کو چاہئے کہ کفار کو (ظاہراً یا باطناً) دوست نہ بنائیں مسلمانوں کی دوستی سے تجاوز کر کے۔ اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: مؤمنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بہ ظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔

مولانا اصلاحی نے اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً میں تُقٰۃ کو مفعولِ مطلق برائے تاکید قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں لغت، نظائرِ قرآن اور سیاق و سباق کا لحاظ کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے، لیکن یہ مفعولِ مطلق برائے تاکید نہیں، بلکہ برائے بیانِ نوع ہے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ

کے ترجمہ میں صراحت ہے۔

صفحہ ۷۳

هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّهٗ (آیت ۳۸) کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے: ''اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا''۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ هُنَالِکَ اسمِ اشارہ مکانیہ ہے نہ کہ زمانیہ۔

صفحہ ۷۸

کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا (آیت ۳۷) ''جب جب زکریا محراب میں اس کے (یعنی مریم کے) پاس جاتا وہاں رزق پاتا''۔ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا میں لفظ رزق سے مولانا نے حکمت ومعرفت مراد لی ہے۔ یہ تنہا مجاہدؒ کا قول ہے اور غریب ہے۔ خود ان ہی کا اور دیگر سارے مفسرین کا دوسرا قول 'بے موسم کا میوہ' ہے۔ ابنِ کثیرؒ نے مسند ابو یعلیٰ کی ایک حدیث بھی نقل کی ہے، جس سے دوسرے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ هُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا میں هُنَالِکَ (اسمِ اشارہ مکانیہ) کے استعمال سے بھی رزق کے مادی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ حکمت ومعرفت کو مکان سے کیا تعلق؟۔

صفحہ ۸۴ و ۸۸

وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (آیت ۴۴) کی تشریح میں مولانا اصلاحی نے لکھا ہے: ''اقلام سے مراد قرعے کے تیر ہیں۔ جوئے کے تیروں کا استعمال تو شریعت میں حرام ہے، لیکن قرعے کے لیے تیروں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے''۔

اقلام سے مراد قرعے کے تیر لینا غلط ہے۔ تیروں کے ذریعہ فال لینا مشرکوں کا طریقہ تھا۔ یہاں 'اقلام' استعمال ہوئے ہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے عکرمہ، سدی اور قتادہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جن قلموں سے یہود توریت لکھتے تھے ان کو انھوں نے دریائے اُردن میں قرعے کے لئے ڈال دیا۔ جس کا قلم پانی کے بہاؤ میں رکا رہا یا الٹا بہہ گیا وہ کامیاب ہوگیا۔

صفحہ ۹۳

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلاً وَّ مِنَ الصٰلِحِيْنَ (آیت ۴۶) کی تشریح میں مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

''موجودہ انجیلوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ادھیڑ ہونے سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، لیکن اس آیت میں حضرت مریمؑ کو ضمناً حضرت عیسیٰؑ کے کہولت تک پہنچنے کی بھی بشارت دی گئی تھی''۔

پھر قرآن کے بیان کی تصدیق کی خاطر انھوں نے انجیل یوحنا کی ایک مبہم روایت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پچاس برس کے قریب قریب اس دنیا میں رہے۔ لیکن یہ کوشش غیر ضروری ہے۔ اگر حضرت عیسیٰؑ ۳۵ برس کی عمر میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے تو پھر دوبارہ بھی تو ان کو آنا ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نزولِ ثانی کے بعد وہ زمین میں چالیس سال ٹھہریں گے، پھر ان کا انتقال ہوگا۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم، ضمیمہ الاحزاب، احادیث دربارۂ نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام)۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کی عمر دونوں ادوار کو ملا کر تقریباً ۷۵ سال ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۲۶ و ۱۲۷

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِم ثَمَناً قَلِيْلاً اُولٰئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ (آیت ۷۷) کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''عَهْدِ اللّٰه سے مراد کتاب و شریعت ہے، اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے ... یہاں اس عام مفہوم کے اندر ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے آخری بعثت کے بارے میں لیا تھا''۔

یہ خاص اشارہ کہاں ہے؟ دوسروں کو کیوں نظر نہیں آیا؟

صفحہ ۱۲۸

اسی آیت (نمبر ۷۷) کے سلسلے میں لکھتے ہیں: ''اس آیت میں تزکیہ کی جو نفی ہے اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے، اس کا محل یہ دنیا ہے...''

عرض ہے کہ اگر آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے تو پھر یہاں اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟! آخرت میں مستحق اہلِ ایمان کا تزکیہ گناہوں کی معافی کے ذریعہ ہوگا۔ اس سے محروم وہی لوگ ہوں گے جو عہد کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے۔

صفحہ ۱۳۳

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (آیت ۸۱) کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے: ''اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا''۔

انھوں نے ترجمہ میں 'تم سے' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے، جب کہ آیت میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: ''**میثاق النبیین**' میں اضافت فاعل کی طرف نہیں، بلکہ مفعول کی طرف ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء سے میثاق لیا گیا، بلکہ انبیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا۔''

یہ صریح تحریف ہے۔ یہ مفہوم کسی دوسرے مفسر نے نہیں لیا۔ سب ہی کے نزدیک یہ میثاق نبیوں سے لیا گیا تھا۔ وہ نبی بھی جو بنی اسرائیل سے پہلے گزرے یا ان میں شامل نہیں تھے اور وہ بھی جو ان کے بعد آئے۔ اسی لیے اس میں بنی اسرائیل کا ذکر نہیں ہے۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: **انهٗ اخذ میثاق کل نبی بعثهٗ من لدن آدم علیه السلام الی عیسیٰ علیه السلام** (اللہ نے آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک بھیجے گئے ہر نبی سے میثاق کیا)۔

اگرچہ مولانا اصلاحی کا بیان کردہ مفہوم بھی قرآن کی دیگر آیات میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس آیت کا مفہوم الگ ہے۔ نبیوں سے یہ میثاق کس چیز کے بارے میں لیا گیا تھا؟ مفتی محمد شفیعؒ نے 'معارف القرآن' میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ

عہد تمام انبیاء سے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں لیا گیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید و نصرت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کر جائیں۔ حضرت طاؤسؒ، حسنؒ بصری اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء سے اس لیے لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی تائید و نصرت کریں۔

صفحہ ۱۷۰

ذیلی عنوان 'منافقین کی ایک شرارت' کے تحت مولانا اصلاحی نے غزوۂ احد کے موقع پر دفاعی حکمتِ عملی کے سلسلہ میں ساری باتیں غلط، بے سروپا اور بے سند بیان کی ہیں۔ ان کے خیال میں صحابہ سے مشاورت کے وقت پہلے سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا ہے، لیکن اس بات کو پوشیدہ رکھ کر امتحاناً آپؐ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہوسکتا ہے کہ باہر نکل کر، چنانچہ انھوں نے پورے جوش و جذبہ کے ساتھ یہی جواب دیا، لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہوکر مقابلہ کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔''

یہ بات بالکل غلط ہے کہ آپؐ نے امتحاناً ایسا کوئی سوال صحابہ کے سامنے رکھا تھا اور یہ کہ آپ کے دل میں پہلے سے یہ بات تھی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے **الرحیق المختوم** میں لکھا ہے: ''پھر آپؐ نے صحابہ کرام کے سامنے دفاعی حکمت عملی کے متعلق اپنی رائے پیش کی کہ مدینے سے باہر نہ نکلیں، بلکہ شہر کے اندر ہی قلعہ بند ہوجائیں۔ اب اگر مشرکین اپنے کیمپ میں مقیم رہتے ہیں تو بے مقصد اور برا قیام ہوگا اور اگر مدینہ میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمان گلی کوچے کے ناکوں پر ان سے جنگ کریں گے اور عورتیں چھتوں کے اوپر سے ان پر خشت باری کریں گی۔ یہ صحیح رائے تھی اور اسی رائے سے عبداللہ بن ابی راس المنافقین نے بھی اتفاق کیا، جو اس مجلس میں خزرج کے ایک سرکردہ نمائندہ کی حیثیت سے شریک تھا''.... لیکن بعد میں ''اکثریت کے اصرار کے سامنے اپنی رائے ترک کردی اور آخری

فیصلہ یہی ہوا کہ مدینے سے باہر نکل کر کھلے میدان میں معرکہ آرائی کی جائے۔''

رہی مولانا اصلاحی کی یہ بات کہ مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کی تجویز کی صرف منافقین نے تائید کی تھی تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ اس رائے میں مہاجرین اور انصار صحابہ کی بڑی تعداد شامل تھی۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'سیرت النبیؐ' (حصہ اول) میں لکھتے ہیں:

''صبح کو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعوں میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول، جو اب تک کبھی شریک نہیں کیا گیا تھا، اس نے بھی یہی رائے دی، لیکن نو خیز صحابہ نے، جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے۔ آں حضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا۔ سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔''

صفحہ ۱۹۲

حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ (آیت ۱۵۲)

اس آیت کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے: ''یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف کیا اور رسول کی نافرمانی کی، جب کہ اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی تھے۔''

پھر ذیلی عنوان 'مَا تُحِبُّوْن کا مفہوم' کے تحت لکھا ہے:

''ماتحبون' میں اشارہ فتح کی تمنا کی طرف ہے۔ قرآن نے بعض جگہ اس ابہام کو کھول بھی دیا ہے، مثلاً: سورۂ صف میں ہے ''وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ''۔

لیکن فتح ہوتی ہوئی دیکھ کر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھیوں کا اپنی حفاظتی چوکی چھوڑ کر دوڑ پڑنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ جب فتح ہو ہی رہی تھی تو یہ لوگ وہاں جا کے کیا کرتے، جب کہ رسول اللہ ﷺ ان کو سختی سے منع فرما چکے تھے۔ درحقیقت یہ مالِ غنیمت ہی کی کشش تھی جس نے انھیں بے تاب کر دیا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازبؓ کی ایک طویل حدیث ہے، جس میں وہ غزوۂ احد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''**فقال اصحاب عبداللہ بن جبیر: الغنیمة ای قوم الغنیمة، ظهر اصحابکم فما تنتظرون؟ فقال عبداللہ بن جبیر: أنسیتم ما قال لکم رسول اللہ ﷺ؟ قالوا: واللہ لنأتینّ الناس فلنصیبنّ من الغنیمة**''۔ (بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر ۲۷۶)۔

''(کافروں کی شکست کا حال دیکھ کر) حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھیوں نے کہا: لوگو، مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے دوڑو۔ تمھارے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے، اب یہاں کیا کر رہے ہو؟ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے (انھیں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) کہا: کیا تم بھول گئے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تم سے کیا فرمایا تھا؟ مگر ان لوگوں نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی اور کہا: اللہ کی قسم، ہم ضرور وہاں جائیں گے اور مالِ غنیمت حاصل کریں گے''۔

غنیمت کی طلب میں کوئی عیب نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اس کی ترغیب دی ہے: وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا (الفتح: ۱۹) ہاں، اس کے لیے سردار کی حکم عدولی قابلِ مواخذہ ہے۔

صفحہ ۱۹۵

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُعَاسًا يَغْشٰى طَائِفَةً مِنْكُمْ (آیت ۱۵۴) کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے:

''پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا، یعنی نیند جو آ کر تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے''۔

نُعَاس کے معنٰی مولانا نے نیند کے لے کر اس ساری کیفیت کو جنگ کے خاتمہ کے بعد آنے والی شب کے موقع کی قرار دیا ہے، حالاں کہ نعاس سے مراد صرف غنودگی تھی، جو دورانِ جنگ مخلص مسلمانوں پر حق تعالیٰ نے طاری کر دی تھی۔ حضرت ابوطلحہؓ، جو اس جنگ میں شریک تھے، خود بیان کرتے ہیں کہ اس حالت میں ہم پر اونگھ کا ایسا غلبہ ہو رہا تھا کہ تلواریں ہاتھ سے چھوٹی پڑتی تھیں۔

صفحہ ۲۰۸ و ۲۰۹

ذیلی عنوان 'اسلامی نظام میں شورائیت کا درجہ' کے تحت غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سے مشورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''....جو منافق قسم کے لوگ تھے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ رہ کر مقابلہ کیا جائے''

آخر اس مشورہ میں منافقت کا کیا پہلو ہے؟ یہ ایک دفاعی تدبیر ہے، جو بعض حالات میں مفید ہوتی ہے۔ آخر غزوۂ خندق میں یہی تدبیر کام آئی یا نہیں؟ صفحہ ۲۰۹ کے حاشیہ میں لکھا ہے: ''تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آں حضرت ﷺ کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، لیکن پر جوش صحابہ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔''

اگر سارے سیرت نگاروں کی یہ بات بے ثبوت ہے تو آپ کی بات کا آخر کیا ثبوت ہے؟

آگے لکھتے ہیں: '' آپ نے اس تدبیر سے جب کم زوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرمالیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بہ طورِ خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضور نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو، اس وجہ سے انھوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔''

اگر جاں نثاروں کا یہ گمان بہ طورِ خود تھا اور حضورؐ نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا

تو آخر آپ نے اس کا اظہار کیوں نہیں فرمایا؟ مروّت و رافت کا تقاضا تھا کہ آپ اپنے جاں نثاروں کی دل جوئی کرتے اور ان کے گمان کا ازالہ فرماتے۔ اس کے بجائے آپ نے ایسی بات ارشاد فرمائی جس سے ان کے گمان کو تقویت ملی۔

صفحہ ۲۱۱

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آیت ۱۶۱)

اس آیت کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے:

''اور ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ بدخواہی کرے اور جو بدخواہی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بدخواہی سمیت پیش ہوگا''۔

غَلَّ، يَغُلُّ غلولاً کے معنی خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کے لے کر مولانا نے ایک لمبی تقریر کر ڈالی ہے، جس میں بتایا کہ منافقوں نے رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام لگایا گیا کہ ''آپ قوم کے اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ یہ صریحاً قوم کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔'' حالاں کہ **یغلّ** کے معنی **یخون** (خیانت کرنا) خود انھوں نے زجاج کی تشریح اور لسان العرب کی تصریح سے نقل کیے ہیں۔ اس مقام کی صحیح تشریح مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن، سورۂ آل عمران، حاشیہ ۱۱۴ میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر (جنھوں نے عقب کی حفاظتی چوکی چھوڑ دی تھی) اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عذرات پیش کیے، جو نہایت کم زور تھے۔ اس پر حضور نے فرمایا: **بل ظننتم انا نغلّ ولا نقسم لکم**۔ 'اصل بات یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا۔ تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہیں دیں گے۔''

صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹

''لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ سَنَكْتُبُ مَا

قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ" (آیت ۱۸۱)

''اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتل انبیاء کو بھی''۔

اس آیت میں اہلِ کتاب یہود کا بیان ہے، کیونکہ اسی آیت میں ان کے ایک مشہور جرم (قتلِ انبیاء) کا ذکر ہے۔ لہٰذا اللہ کو محتاج اور خود کو غنی کہنا بھی یہود کا ہی قول ہوسکتا ہے۔ مولانا اصلاحی نے اسے منافقین کا قول قرار دیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

☆☆☆

اسلام اور مشکلاتِ حیات

مولانا سید جلال الدین عمری

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں پر مشکلات اور مصائب کیوں آتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو ملّی اور اجتماعی، شخصی اور انفرادی مشکلات سے کیوں گزارا جاتا ہے؟ امراض، جسمانی تکالیف، مالی مشکلات، حادثات اور صدمات میں ایک مومن کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ مرض اور مشکلاتِ حیات میں خودکشی کیوں ناجائز ہے؟ مرض کی شدّت میں کسی کی جان کیوں نہیں لی جاسکتی؟ یہ کتاب قرآن و حدیث کی روشنی میں ان سوالات کے جوابات فراہم کرتی ہے۔ مؤثر اندازِ بیان، دل نشیں بحث اور علمی اسلوب۔

آفسیٹ کی حسین طباعت، خوب صورت سرورق، صفحات: ۴۸ قیمت =/۲۵ روپئے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵